eISSN:2073-3674
pISSN:1991-7813

CC BY
OPEN ACCESS

غلام عباس کے افسانوی کرداروں میں دوہرا پن

(سماجی حقیقت نگاری کی توانا مثال)

Duality of the fictional characters of Ghulam Abbas

(Solid Example of Social Realism)

ڈاکٹر محمد خاور نوازش
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

Dr. Muhammad Khawar Nawazish
Associate Professor, Department of Urdu, BZU Multan
Email: khawarnawazish@bzu.edu.pk

Received13-3-2022**Accepted:**11-4-2022 **Online:**28-6-2022

Abstract:
Ghulam Abbas (1909-1982) is one of the leading Urdu short story writers whose fiction is a powerful example of social realism. He devoted a lot of energy in crafting of his fictional writings. More importantly, Ghulam Abbas did not adopt the line of protest or resistance like his contemporaries, but adopted the attitude of reconciliation with the duality, hypocrisy and deception of the human personality because he believed that all these things and attitudes have become essential, so they need empathy and acceptance. It is as if Ghulam Abbas is not only guilty of sin but also of dishonesty in committing sins. This article discusses the duality and deception in the characters of Ghulam Abbas's short stories and presents it as a great example of social realism.

Key Words:
Shory Story, Duality, Duplicity, Characters, Fictional, Hypocrisy, Deception

کلیدی الفاظ :اردو افسانہ۔ دوہرا پن۔ دوئی۔ فریب۔ کردار۔ افسانوی۔ منافقت۔

دوہرے پن کا منبع فریب ہے اور یہ انسانی زندگی کی وہ تلخ حقیقت بھی جس کو تسلیم کرنا اور لکھنا ہر لیکھک کے بس کی بات نہیں۔ ریاکاری، دھوکا اور منافقت اُسی دوہرے پن کی بائی پراڈکٹس ہیں۔ اُردو افسانے کی روایت میں سعادت حسن منٹو نے اس موضوع پر سب سے زیادہ لکھا اور متنوع زاویوں سے اس کی عکاسی کی لیکن منٹو، بیدی، کرشن چندر اور عصمت چغتائی ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے انسانی زندگی کی اس تلخ حقیقت کے سامنے مزاحمتی انداز اپنایا۔ دوہرے پن اور منافقت کے خلاف لکھا۔ دوسروں لفظوں میں اس معاشرتی برائی کی مذمت کی، اور اس کے حامل کرداروں کو انسانی سماج کا ناسور سمجھتے ہوئے ناقابلِ قبول گردانا۔ اِن افسانہ نگاروں کے معاصرین میں سے واحد غلام عباس (۱۹۰۹ء۔ ۱۹۸۲ء (ہیں جنھوں نے فریب اور اس کی بائی پراڈکٹس دوہرے پن، ریاکاری اور منافقت کو انسانی زندگی اور معاشرے کا لازمی حصہ بلکہ حقیقت سمجھتے ہوئے قبول کیا۔ اسی لیے اِن رویوں کے حامل کرداروں کے لیے اُس کے ہاں مزاحمت سے زیادہ ہمدردی نظر آتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ دوہرے پن اور فریب کو انسان کی ایسی کمزوری سمجھتے ہیں جس پر قابو پا کر وہ معاشرے میں بیگانگی کا شکار ہو سکتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں دوہرا پن انسانی شخصیت کا لازمی حصہ بن چکا ہے اور وہ جو منافق نہیں، حق پر کھڑا ہوتا ہے یا سچ کا پرچارک ہے وہ اُس پورے گروہ کو خوش رکھ سکتا ہے نہ ہی اُس میں سکون سے زندگی کر سکتا ہے جس کا وہ حصہ ہے۔ غلام عباس کے افسانوی کردار معاشرے کے ایسے ہی عام لوگ ہیں جن کے اندر سوچ اور عمل کا دوہرا پن ایک فطری امر نظر آتا ہے۔ محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

> "یہ ہے غلام عباس کے افسانوں کا مرکزی اور بنیادی جذبہ ....انسان کی فریب خوردگی اور حماقت۔ یہ احساس بڑے اندوہ و الم یا شدید کلبیت کا موجب بن سکتا ہے۔ مگر غلام عباس کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ یہاں بھی ان کے مزاج کی اعتدال پسندی آڑے آئی۔ وہ فریب خوردگی اور حماقت پر نہ تو رنج کا اظہار کرتے ہیں، نہ غم و غصے کا، نہ ابلیسانہ طمانیت کا۔ انھیں انسان کی اس بنیادی کیفیت پر کچھ تاسف بھی ہوتا ہے، کچھ ہنسی بھی آتی ہے، کچھ حیرت بھی ہوتی ہے۔ مگر فی الجملہ وہ شش و پنج میں پڑ جاتے ہیں کہ آخری

فیصلہ کیا کریں۔ چنانچہ وہ کوئی آخری فیصلہ نہیں کرتے بلکہ ایک طرح ہم کہہ سکتے ہی، ان کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ جب انسانی زندگی مسلسل فریب ہے ہی تو پھر فریبوں کو قبول کرنے کے سوا اور کیا چارۂ کار ہے۔(۱)"

دوہرے پن اور فریب خوردگی کی طرف قبولیت کا رویہ دوسرے معنوں میں زندگی سے مصالحت بھی ہے جس کی طرف درج بالا اقتباس میں محمد حسن عسکری نے اشارہ کیا ہے۔ یہ مصالحت جینے کے لیے راہِ نجات کی تلاش بھی ہو سکتی ہے۔ جب اُن کا کوئی افسانوی کردار آئینے میں اپنی حقیقی صورت دیکھ کر اندر ہی اندر ناخوش ہوتا ہے تو اپنے اُوپر ایک دوسری صورت اوڑھ لیتا ہے اور پھر لوگوں کو چہروں کو آئینہ سمجھ کر اُن میں اپنی دوسری صورت کو دیکھتا ہے۔ یوں وہ کردار نہ صرف مطمئن محسوس ہوتا ہے بلکہ اندر کے دُکھ سے راہِ نجات بھی پالیتا ہے۔ معاشرتی حقیقت نگاری کا یہی انداز غلام عباس کو اپنے معاصرین سے منفرد بناتا ہے کہ وہ انسانی کمزویوں پر مصلح، مبلغ یا مزاحم کا رُوپ اختیار کرنے کے بجائے اُنھیں قبول کرنے کی راہ پر کھڑا ہے۔

غلام عباس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "آنندی" مکتبہ جدید، لاہور سے ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ دس افسانوں پر مشتمل اس مجموعے کا سب سے اہم افسانہ "آنندی" ہے جس میں بظاہر کوئی مرکزی کردار نہیں لیکن دراصل پورا شہر ہے مرکزی کردار ہے۔ یہ افسانہ انسانی رویوں میں دوہرے پن کی سب سے موثر مثال ہے۔ ایک شہر کی آبادکاری سے اُجڑنے تک کے عمل کی عکاسی اور اس میں بالخصوص شہر کے شرفاء اور معززین کا عمل دخل، جو دن کے اُجالے میں بلدیہ کے مشترکہ اجلاس میں طوائفوں اور ان کے کوٹھوں کو شہر کی غلیظ ترین جگہ قرار دیتے ہیں وہ رات کی تاریکی میں انھی طوائفوں کے پاس موسیقی اور رقص کی محفلوں میں دل بہلانے کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اُن کی خدمت میں طرح طرح کے تحائف بھی لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ "آنندی" میں زنانِ بازاری کو شہر بدر کرنے والے شرفاء کی اولادیں ان بیسواؤں کی نئی بستی میں پیچھے پیچھے پہنچ جاتی ہیں۔ اس افسانے سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

"اور پھر حضرات آپ یہ بھی خیال فرمایئے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے بڑے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گزر گاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس شہر سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفاء کی پاکِ دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ، نیم عریاں، بیسواؤں کے بناؤ سنگھار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی نئی اُمنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں۔(۲)"

" کبھی کبھی شہر کے لفنگے اوباش، بے کار مباش کچھ کیا کرو، کے مصداق شہر سے پیدل چل کر، بیسواؤں کی اس نئی بستی کی سُن گُن لینے آجاتے.... وہ ان سے ذرا ہٹکر ان کے گرداگرد چکر لگاتے رہتے، فقرے کستے، بے تکے قہقہے لگاتے، عجیب عجیب شکلیں بنانے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔ اس روز کبابی کی خوب بِکری ہوتی۔(۳)"

"شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایہ پر اُٹھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنواڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھیں، موروملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد گئیں۔(۴)"

انسانی روّیوں اور کرداروں کے اس دوہرے پن کو ہم منافقت بھی سمجھ سکتے ہیں لیکن دراصل یہ زندگی کی حقیقت ہے۔ بیسواؤں کو شہر سے نکالنے والوں میں س ایک مدرس نے بچوں کی امتحان میں ناکامی کی وجہ بھی انھی کو قرار دیا، ایک معمر رکن نے اپنی رات کی نیند میں خلل کی وجہ انھی کو گردانا۔ یہ کہانی اس حقیقت کو آشکار کرتی ہے کہ ہم اچھے یا برے معاشرے یا ماحول کے جو معیارات اپنے تئیں طے کرتے ہیں بنیادی طور پر وہ زمینی حقائق سے رُوگردانی اور فریب خوردگی پر اساس ہوتے ہیں۔ اخلاقی طور پر اچھا یا برا ہونے کا تعلق انسان

کے پیشے سے نہیں، یا اُس کے کام سے نہیں بلکہ اس کے رویوں سے ہے۔ جن بیسواؤں کو اخلاقی گراوٹ کا سبب قرار دے کر شہر سے نکالا جاتا ہے وہی شہر کے بہت سے لوگوں کی روزی کا وسیلہ بنتی ہیں لیکن شہر کے باسیوں کی ظاہر اور باطن کے تضاد پر مبنی سوچ ایسے حقائق کو نظر انداز کرتی ہے۔ اِسی مجموعے کا ایک اور افسانہ "حمام میں" بھی اس حوالے سے اہم ہے۔

اس میں نچلے اور متوسط طبقے کے کچھ کرداروں کو ایک مخصوص معاشرت کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ مرکزی کردار "فرخ بھابی" اپنی ذات میں دوہرے پن کا شکار ہے۔ اس کا گھر کسی ہوٹل کا کمرہ یا چائے خانہ کا منظر پیش کرتا ہے جہاں مختلف الطبع لوگ موجود ہیں، مختلف موضوعات پر گپ شپ، تاش کی بازی اور پھر وہیں سونا جاگنا۔ اس افسانے میں غلام عباس نے جنس کا اظہار برملا تو نہیں کیا لیکن جنسی نفسیات کو موضوع ضرور بنایا ہے۔ کہانی کا تانا فرخ بھابی اور اُس سے جڑے ہوئے کرداروں کے گرد بنا گیا ہے۔ فرخ بھابی اندر سے ایک مذہبی عورت ہے، صوم وصلوٰۃ کی پابند ہے لیکن اپنے ارد گرد ایسے کرداروں کی موجودگی میں تحفظ اور اطمینان محسوس کرتی ہے جو اس کی اندرونی شخصیت سے متضاد مزاج رکھتے ہیں، بلکہ انھی کرداروں میں سے ایک میر نوازش علی کی طرف جنسی کشش بھی رکھتی ہے۔ بقول ڈاکٹر فاروق عثمان:

> "وہ اپنے پرانے دوستوں کی خواہشات کے برعکس میر صاحب سے میل جول بڑھاتی ہے، یہ فیصلہ یہ انتخاب کسی معاشی جبر کا شاخسانہ نہیں اس عورت پنے کا تقاضا ہے جو ایک مکمل مرد کے قرب میں تحفظ کا احساس چاہتا ہے.... تسلیم ورضا کا پیکر بننا، خدمت گزاری کا شاہکار ہونا، کتنا بودا اور کتنا نامکمل ہے۔(۵)"

فرخ بھابی کی شخصیت کا یہ دوہرا پن فطری ہے اور دراصل معاشرتی سوچ کے جبر کا شاخسانہ ہے۔ وہ اپنے فطری جنسی تقاضوں کو روک نہیں سکتی لیکن بظاہر تسلیم ورضا اور خدمات گزار کا پیکر بن کر زندگی گزارتی ہے۔ اُس کی خواہش ہے کہ اس کے احباب اُسے پارسائی کا پیکر سمجھیں اس لیے وہ صوم وصلوٰۃ کی مکمل پابندی بھی کرتی ہے۔ اس میں دوہرے پن کا حامل

ایک اور اہم کردار مولانا کا ہے۔ وہ امام مسجد ہے لیکن اُس کا دوسرا رُوپ شیطانی ہے۔ وہ جادو اور سفلی علوم کا بھی دلدادہ ہے۔ فرخندہ (فرخ بھابی) اور میر نوازش علی کے درمیان تعلق کی استواری میں بنیادی کردار مولانا کا ہی ہوتا ہے۔ اس کی مکاری کا ایک انداز دیکھئے:

"تم چُپ رہو جی.... ایک شخص جو پہلی ہی ملاقات میں دوسروں پر اس طرح بے دریغ روپیہ خرچ کرنے لگتا ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے دل میں کیا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ" مولانا سے پھر چُپ نہ رہا گیا۔ "عدیل میاں! آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ خدانخواستہ انھوں نے فرخ بھابی کو یہ ساری کسی بُری نیت سے تھوڑا ہی لے کر دی ہے، وہ تو ہمیشہ سے ایسے ہی فیاض واقع ہوئے ہیں۔(۶)"

غلام عباس کے ہاں کردار خواہ کتنے ہی ذہنی تضادات اور شخصی دوہرے پن کا شکار کیوں نہ ہوں وہ انھیں منفی اور مثبت کے رخنوں میں تقسیم کر کے پیش نہیں کرتا۔ اس افسانے میں بھی کوئی کردار بظاہر منفی کردار نہیں۔ وہ کردار کے حوالے سے نقطۂ نظر قائم کرنے کا اختیار قاری پر چھوڑ دیتے ہیں اور خود کو صرف ایک مخصوص زمانے کے معاشرتی ماحول کی پیش کاری تک محدود رکھتے ہیں۔

"سمجھوتہ" میں شوہر کا کردار بھی فریب خوردگی کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ اُس کی بیوی جب تک کسی اور کے ساتھ نہیں بھاگی تھی وہ اُسے شدید محبت کرتا تھا۔ لیکن گھر سے بھاگنے کے بعد خیال ہی خیال میں وہ اُس کا گلا دبانے تک گیا، اُس سے شدید نفرت میں مبتلا ہو اور طوائفوں کے پاس جانے لگا۔ وہ یہ سوچنے کو تیار ہی نہیں کہ اُس کی بیوی گھر سے آخر کیوں بھاگی بلکہ اپنی محبت کی شدت اور بیوی کی خدمت گزاری کے بارے میں سوچتا ہے اور اُس بے وفا قرار دے کر انتقام کی آگ میں بھڑکتا ہے لیکن اُس کا دھیان اپنی کسی بھی کمزوری یا کمی کی طرف نہیں جاتا۔ جب بیوی گھر لوٹ آتی ہے تب بھی وہ اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور بیسواؤں کے پاس جاتا رہتا ہے تاوقتیکہ اُس کے پاس معاشی وسائل ختم نہیں ہوتے۔ معاشی وسائل کا خاتمہ ہی بالآخر اسے اپنی بیوی کی طرف واپس متوجہ کرتا ہے اور وہ خود کو سمجھاتا ہے کہ اگرچہ اُس کی بیوی باعصمت نہیں لیکن وہ عورتیں بھی کون سی عفیفہ ہیں جن کے

پیچھے وہ قلاش ہو گیا۔ اس کردار کی سوچ کا دوہرا پن نفسی کے ساتھ ساتھ معاشی و معاشرتی جبر کا شاخسانہ ہے۔ بیوی سے شروع میں محبت نفسی معاملہ ہے، اُس کے بھاگ جانے پر غصے کی آگ نفسی کے ساتھ معاشرتی اسباب سے جنم لیتی ہے اور اُس سے واپس رجوع کا معاملہ معاشی بنیادوں پر طے پاتا ہے۔ افسانہ نگار نے اس کہانی میں ایک طرف شوہر کے کردار کے ذریعے فریب خوردگی کے عنصر کو انسانی زندگی کی حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے جس سے بالآخر مصالحت ہی مسئلے کا حل ہے اور دوسری طرف جنسی جبلت کو محبت سے زیادہ طاقت ور جذبے کے طور پر بھی دکھایا ہے۔

"اور کوٹ" غلام عباس کے دوسرے افسانوی مجموعے "جاڑے کی چاندنی" (۱۹۶۰ء) کا پہلا افسانہ ہے۔ "آنندی" کے بعد غلام عباس کے اس افسانے کو سب سے زیادہ شہرت ملی۔ یہ افسانہ عام انسانی کرداروں کے دوہرے پن کا بہت موثر اظہار ہے۔ ہمارے معاشرے کا وہ نچلا طبقہ جس کے پاس بالائی طبقے جتنی آسائشیں موجود نہیں، جن کے پاس زندگی میں عزت پانے کی خواہش تو ہے لیکن اس کے وسائل موجود نہیں وہ اپنے اوپر ایک مصنوعی لبادہ اوڑھ کر ایک طرح سے بالائی طبقے کی زندگی کا تمسخر اڑاتا ہے۔ "اور کوٹ" کا مرکزی کردار جس بہروپ کو پیش کر رہا ہے وہ صرف لباس کا بہروپ نہیں بلکہ ہمارے سماجی معیارات میں بھی دوہرے پن کی پیش کش ہے۔ مرکزی کردار کی روح خواہ معاشی و معاشرتی جبر سے کتنی ہی شکستہ ہو لیکن وہ ایک خوبصورت اور کوٹ زیب تن کر کے اور سڑک پر چلتے ہوئے، قالینوں، گراموفون اور کتابوں کی دکانوں پر اشرافیہ کے انداز میں حرکات و سکنات کرتے ہوئے اُس شکستگی کو چھپانے میں کامیاب رہا تھا تاوقتیکہ موت نے اُس کی اصلیت کو ظاہر نہ کر دیا۔ اقتباس دیکھئے:

> "بلاشبہ وہ اس وقت دم توڑ چکا تھا۔ اس کا جسم سنگ مرمر کی میز پر بے جان پڑا تھا۔ اس کا چہرہ جو پہلے چھت کی سمت تھا، کپڑے اتارنے میں دیوار کی طرف مڑ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جسم اور اس کے ساتھ روح کی اس برہنگی نے اسے خجل کر دیا ہے اور وہ اپنے ہم جسموں سے آنکھیں چُرا رہا تھا۔(۷)"

فضیل جعفری لکھتے ہیں کہ:

"اور کوٹ کا ہیرو اس طبقے کا نمائندہ ہے جسے کھل کھیلنے اور داد عیش دینے کے مواقع حاصل نہیں ہیں لیکن جو بہر حال زندگی کی گہما گہمی، چہل پہل، چھیڑ چھاڑ اور لذت پرستی سے لطف اندوز ہونے کا خواہاں نظر اتا ہے۔(۸)"

"اور کوٹ" پہنا ہوا دوہرے پن کا حامل نوجوان ہمارے مجموعی معاشرتی نظام کی بھی ایک علامت ہے۔ یہ نظام جو اندر سے انتہائی کھوکھلا ہے، کمزور ہے بلکہ نوجوان کی پھٹی ہوئی جرابوں کی طرح اس کی ایک کَل دوسرے سے نہیں ملتی اور بظاہر اس نظام پر مذہب اور اخلاقیات کے دیدہ زیب لبادے چڑھائے گئے ہیں۔ غلام عباس نے اشارہ کیا ہے کہ ہماری اصلیت اُن لبادوں کے نیچے چھپی ہوئی ہے اور اُس کا بھرم اُسی وقت تک قائم ہے جب تک اس نظام کا خاتمہ نہیں ہوتا۔

"بردہ فروش" اگرچہ ایک طوائف کی معاشرتی حیثیت کے موضوع پر لکھی گئی کہانی ہے لیکن اس کے دو کردار کرم دین اور چودھری گلاب انسانی سوچ اور رویوں کے دوہرے پن کا موثر اظہار ہیں۔ دونوں بظاہر ریشماں کے پیچھے لیکن دراصل اپنی انا اور اُسے خریدنے اور گھر میں بسانے پر ہونے والے اخراجات اور اُس سے دھوکا کھانے پر ہونے والے معاشی نقصان اور دِلی دُکھ کی ملی جلی کیفیات میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتے ہیں لیکن یک دم ریشماں کی ہنسی سے اپنی انا مجروح ہونے کا خیال انھیں ایک کر دیتا ہے۔ وہ باہمی لڑائی کو بھول کر اُسے سبق سکھانے کی ٹھان لیتے ہیں۔ اسی اثنا میں بردہ فروش مائی جمی نمودار ہوتی ہے تو ریشماں کو ایک تیسرے مرد کے ہاتھوں بیچ کر نقصان پورا کرنے کی اُس کی تجویز سے متفق ہو کر اپنے گھر کی طرف ایسے روانہ ہوتے ہیں کہ جیسے اُن کے درمیان کبھی کوئی جھگڑا ہوا ہی نہ ہو۔ اقتباس دیکھئے:

"اچانک کرم دین نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ذرا تھم جاؤ۔ اس کے تہمد کا پلو جس کو اس نے لنگوٹ کی طرح پیچھے اُڑس رکھا تھا باہر نکل آیا۔ اسے ایک ہاتھ میں چھَوی اور دوسرے میں لنگوٹ تھامے دیکھ کر ریشماں ضبط نہ کر سکی، اور اُس نے بے اختیار قہقہہ لگا دیا۔ دونوں مرد پلٹ کر اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

ریشماں ہنسے جا رہی تھی۔ ہر چند اسے احساس تھا کہ ایسے نازک وقت میں اس کا ہنسنا بڑا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، مگر اسے پرواہ نہ تھی۔

"اگر میں زندہ بچ رہا۔" کرم دین نے کھسیانا ہو کر کہا"تو سب سے پہلے اسی چھنال کے ٹکڑے کروں گا۔"

اس بے حیا کو تو اب میں بھی گھر میں نہیں بساؤں گا۔" چودھری گلاب نے کہا۔"بس ناک کاٹ کے چھوڑ دوں گا۔"

"تو چودھری آؤ پہلے کیوں نہ اس کا قصہ پاک کریں، ہم بھی کیسے بے وقوف ہیں کہ اس فاحشہ کے پیچھے جانیں دیئے دیتے ہیں۔ اس کا کیا ہے کل کسی اور کی بغل گرم کر رہی ہو گی۔"

چودھری گلاب نے کچھ جواب نہ دیا، کرم دین نے اس کی خاموشی کو رضا تصور کیا اور وہ یکبارگی چھَوی لے کر ریشماں کی طرف جھپٹا(۹)"....

کرداری دوہرے پن کی یہ مثال بہت عمدہ ہے۔ دونوں بڈھے جس عورت کی خاطر باہم گتھم گتھا تھے اُس کی طوائف کی حیثیت کا خیال آتے ہی اُن کا غصہ ایک دوسرے سے ہٹ کر ریشماں کی طرف منتقل ہو گیا۔ ریشماں جو چودھری گلاب کے گھر میں آباد ہونے کے بعد مائی جِمی سے پیچھا چھڑانے اور ایک عزت والی زندگی کی خواہش کر رہی تھی، دوبارہ ایک اندھیری کوٹھری کی مکین ٹھہری۔ گویا یہی طوائف کی وہ معاشرتی حیثیت ہے جس کو بدلنے کی خواہش اور کوشش کر کے بھی وہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ حسن نوشاہی نے درست نشاندہی کی ہے کہ اصل مجرم تو وہ ہیں جو طوائف کے خریدار ہوتے ہیں:

"دونوں طاقتور فریق اصل مجرم ہوتے ہوئے بھی سماج میں عزت و تکریم پاتے ہیں۔ مجرمانہ فعل کے اصل ذمہ دار ہوتے ہوئے بھی یہ سارا جرم "فاحشہ" ریشماں پر ڈال کر خود اس گناہ سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ ریشماں بے چاری پر تو یہ حالت زبردستی مسلط کی گئی ہے۔(۱۰)"

"دو تماشے" میں غلام عباس نے مرکزی کردار مرزا برجیس قدر کے سامنے دو مختصر دورانیے کے کھیل پیش کیے ہیں اور دکھایا ہے کہ انسان جو حقیقی زندگی میں اپنی آنکھوں

کے سامنے چلنے والے ایک کھیل پر جذباتی نہیں ہوتا لیکن وہی کھیل جب سکرین کے پردے پر اُس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو اُس کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ مرزا برجیس قدر کا اپنی روزمرہ زندگی میں ایک بھیک مانگنے والی بچی سے سامنا ہوتا ہے تو قریب آنے پر اُس بچی کے جسم کی میل سے مرزا صاحب کو گھِن آتی ہے لیکن ویسا ہی ایک کردار جب سینما میں فلم دیکھتے ہوئے اُسے سڑک پر نظر آتا ہے تو مرزا صاحب کی آنکھوں نے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ غلام عباس نے اس مختصر افسانے میں انسانی شخصیت کی دُوئی کو عمدگی سے پیش کیا ہے۔

دوہرے پن کے حامل کرداروں کے ضمن میں غلام عباس کا ایک لازوال کردار "فینسی ہیئر کٹنگ سیلون" کا منشی ہے جو رہنے کے لیے دو گز زمیں کا طلب گار ہونے سے شروع ہوا اور بالآخر اپنی چالاکی اور دھوکا دہی سے سیلون کا اصل مالک بن گیا اور مالکان کو اپنا تنخواہ دار ملازم بنالیا۔ اُس کردار کی مکاری اور دھوکا دہی اپنی جگہ پر اہم ہے لیکن افسانہ نگار نے سیلون کے مالکان پر زوال کی اصل وجہ خود غرضی اور باہمی مخاصمت کو سمجھا ہے۔ چار حجاموں کو الاٹ ہونے والی دُکان کے تناظر میں دراصل اُس پوری نسل کی عکاسی کی گئی ہے جنھوں نے قربانیوں حاصل ہونے والے اس ملک کو باہمی لڑائیوں اور خود غرضی سے اس نہج پر پہنچادیا کہ اس کی بقا کے لیے ہر چیز گروی رکھنا پڑ گئی۔ آغا سلمان باقر لکھتے ہیں:

> "یہ محض چار حجاموں اور ایک منشی کا قصہ نہیں ہے۔ یہ آج کا عالمی اور آفاقی قصہ ہے۔ یہ ایک کہانی نہیں، سبق ہے۔ اس کے پس منظر میں قوموں کی معیشت کے ذریعے تباہی کی داستان پوشیدہ ہے.... زمانے کے موجودہ دستور میں یہی طور طریقہ اور المیہ کار فرما ہے۔ یعنی معیشت سے کمر توڑو اور حکمرانی حاصل رلو۔ خوشحالی کا خواب دکھا کر قرض دو اور پھر سود کے ساتھ حکومت بھی قابو کرلو۔(۱۱)"

اس افسانے کے اختتام پر منشی کے دو جملے بہت معنی خیز ہیں، ملاحظہ کیجیے:

> "اگر آپ میری تجویز کی ہوئی تنخواہ منظور کریں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، بلکہ اس بات کا ٹھیکہ لیتا ہوں کہ ہر مہینے آپ کو پوری تنخواہ ملا کرے

گی۔" .... "آپ نے میرے ساتھ ایسی بھلائی کی ہے کہ میں عمر بھر نہیں بھول سکتا۔(۱۲)"

یہی دو جملے منشی کے کرداری دوہرے پن اور فریب کی عکاسی ہیں۔ یہی وہ انداز ہے جس کے ذریعے معاشرے کے خود غرض اور معصوم ہر دو طرح کے طبقات کے ساتھ منافقت کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔

"کن رس" غلام عباس کے اسی نام کے افسانوی مجموعے (1969ء) کا پہلا افسانہ ہے۔ اس کا مرکزی کردار فیاض ہے جس کا تعلق ایک غریب مذہبی گھرانے سے ہے، صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ سُر سے بھی رغبت رکھتا ہے۔ بچپن میں تو حمد و نعت اور قوالی کا شوق رکھتا تھا، پھر جوان ہوا تو والد کی وفات کے بعد اس شوق نے اُسے اپنی اگلی نسل کے لیے آن لیا۔ وہ خود تو گویانہ بن سکا لیکن اپنی بیٹیوں کو یہ فن سکھانے کی دھن اُس پر سوار ہو گئی۔ اسی اثنا میں اُسے اُستاد حیدری خاں کی صورت میں ایک ایسا کردار ملتا ہے جو شخصی دوہرے پن کی توانا مثال بن کر سامنے آتا ہے۔ افسانہ نگار نے اس کردار کو خیر کے پردے میں شر انگیزی اور ایک گھر کی نارمل زندگی کی تباہی کا موجب دکھایا ہے۔ حیدری خاں موسیقی میں کمال فن کے باوجود زمانے کی ناقدری کا شکار ہوئے۔ اُنھوں نے فیاض کو اپنی خوش شکل بیٹیوں نجمہ اور سلیمہ کو موسیقی کے ساتھ ساتھ رقص سکھانے پر جس طرح رضامند کیا اس کی مثال ملاحظہ کیجیے:

...."بچیاں ماشااللہ سے ایسی خوبصورت ہیں جیسے چاند کا ٹکرا۔ ان کو تو کسی قدر دان رئیس کے ہاں رانی بن کر راج کرنا چاہیے مگر میاں صاحبزادے امیر لوگ شادی بیاہ کے معاملے میں بڑی مین میخ نکالتے ہیں لیکن خوبصورت ہو، پڑی لکھی ہو، بہت سا جہیز لائے اور پھر اسے کوئی ہنر بھی آتا ہو جیسے گانا یا مصوری۔ مگر ان بچیوں میں سوائے صورت شکل کے اور رکھا ہی کیا ہے۔

مجھے کئی دن دن سے اس بات کی بڑی فکر تھی۔ تم دونوں میاں بیوی تو سو جاتے تھے مگر میں رات رات بھر اس فکر میں غلطاں پیچاں رہتا تھا۔ آخر سوچ سوچ کر میں نے یہ ترکیب نکالی ہے کہ ان لڑکیوں کو تھوڑا سا ناچ گانا سکھا دیا جائے۔

تم جانو آج کل امیر امرا میں ناچ گانے کا شوق جس قدر ترقی پر ہے۔ پہلے ہندوؤں نے یہ بات شروع کی تھی۔ ان کی دیکھا دیکھی اب مسلمان بھی اپنی بیٹیوں کو گانا بجانا سکھلانے لگے ہیں۔

....میں نے جو بات سوچی ہے تمہارے ہی بھلے کی سوچی ہے۔ میرے نہ آل نہ اولاد۔ جو کچھ ہو تمہیں ہو۔ پھر میں تمہارا بُرا کیوں چاہوں گا۔(۱۳)"

اُستاد حیدری خاں کی اس منافقانہ تقریر کے بعد فیاض اپنی بیٹیوں کو گانا اور رقص سکھانے پر آمادہ ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ بالآخر گھر سے بے گھر ہونے اور اپنی اولاد سمیت اُس محلے میں پہنچنے کی صورت میں بر آمد ہوتا ہے جہاں امرا و شرفا دل بہلانے کے لیے تو آسکتے ہیں لیکن کسی عورت کو اپنے محل کی رانی بنانے کے لیے نہیں۔ اُستاد حیدری خاں افسانے کے آخر میں غائب ہو جاتا ہے اور ایک تاثر ملتا ہے کہ جیسے اُس کی بیوی اصغری کو بھی حیدری خاں نے رام کر لیا ہو۔

دوہرے پن کا حامل سب سے نمایاں کردار "بہروپیا" ہے لیکن اس کہانی میں دراصل اُس مرکزی کردار سے زیادہ سماج کے بہروپ، دوہرے معیارات اور منافقت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خود بہروپیے کا کردار بھی اس سماجی دوہرے پن سے متاثر ہے۔ افسانہ نگار یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ یہ بہروپ ہی سماج کی حقیقت ہے اور اسی کو قبول کرنا زندگی سے معانقہ ہے۔ بہروپ کے پیچھے کون ہے، اصل انسان کا رُوپ کیا ہے اس کی تلاش غلام عباس کے خیال میں بے معنی عمل ہے۔ اسی لیے اسلم اور مدن مرکزی کردار بہروپیے کا اصل رُوپ دیکھنے کا خیال ہی چھوڑ دیتے ہیں۔

غلام عباس کے ہاں دوہرے پن کے حامل کردار کم و بیش تمام کہانیوں میں ہی مل جاتے ہیں۔ کہیں یہ مرکزی کردار کی خاصیت نظر آتی ہے تو کہیں ضمنی کرداروں میں سے کسی میں یہ رویہ موجود ہے۔ "سایہ"، "شمشاد"، "بھنور"، "غازی مرد" اور "تنکے کا سہارا" وغیرہ کے مختلف کرداروں میں بھی شخصیت اور سوچ کی دوئی کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ غلام عباس کے لیے یہ انسانی زندگی کی حقیقت ہے۔ کہیں یہ دوئی مذہب اور اخلاقیات کی آڑ میں ابھر کر سامنے آتی ہے، کہیں معاشرتی اور معاشی جبر انسانی رویوں میں دوہرے پن کا سبب بنتا

ہے، کہیں قدیم اور جدید کے ٹکراؤ سے اور کہیں محبت اور جبلت کی نفسیاتی کشمکش سے، تاہم ہر صورت میں غلام عباس نے اسے "سچ" کے طور پر قبول کیا ہے۔ ن م راشد لکھتے ہیں:

> "اس کے کردار دھوکا نہیں کرتے، دیانت داری سے "گناہ" کے مرتکب ہوتے ہیں اور محض اپنی ازلی انسانی مجبوریوں کی وجہ سے ان کی بظاہر بے حیائی میں بھی اکثر ان کی زندہ دلی بدستور قائم رہتی ہے۔(۱۴)"

گویا دیانت داری سے گناہ کے ارتکاب بھی انسان کی خوبی ہے، دوسرے لفظوں میں اپنی کمزوریوں اور کمیوں کو تسلیم کرنا اور مجبوریوں کے نام پر انسانوں سے جو زیادتیاں سرزد ہوتی ہیں اُن پر نادم ہونا۔ غلام عباس کے اندر کا کرب یہی ہے کہ اُسے انسانوں میں یہ ندامت مفقود نظر آتی ہے، اسی لیے انھوں نے نہایت سادگی سے اپنے افسانوی کرداروں کا دوہرا پن دکھا کر اُس ندامت کے احساس کا راستہ ہموار کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حسن عسکری، غلام عباس کے افسانے، مشمولہ: غلام عباس: فکر و فن، مرتبہ: ایم خالد فیاض، راولپنڈی: نقش گر، ۲۰۱۰ء)، ص ۳۲

۲۔ غلام عباس، آنندی، مشمولہ: زندگی، نقاب، چہرے، کراچی: دانیال، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵۵

۳۔ ایضاً، ص ۱۶۲

۴۔ ایضاً، ص ۱۷۰

۵۔ غلام عباس، حمام میں، مشمولہ: زندگی، نقاب، چہرے، ص ۱۶۵۔۱۶۶

۶۔ ایضاً، ص ۸۴

۷۔ غلام عباس، اور کوٹ، مشمولہ: زندگی، نقاب، چہرے، ص ۱۸۲

۸۔ فضیل جعفری، غلام عباس کا افسانوی ادب، مشمولہ: غلام عباس: فکر و فن، ص ۷۷

۹۔ غلام عباس، بردہ فروش، مشمولہ: زندگی، نقاب، چہرے، ص ۲۸۰۔۲۸۱

۱۰۔ حسن نوشاہی، غلام عباس کے افسانے: سماجی جبریت کا اظہار، مشمولہ: غلام عباس: فکر و فن، ص ۲۵۳

۱۱۔ آغا سلمان باقر، غلام عباس کا افسانہ "فینسی ہیئر کٹنگ سیلون": ایک عمیق تجزیہ، مشمولہ: غلام عباس: فکر و فن، ص ۱۷۷

۱۲۔ غلام عباس، فینسی ہیئر کٹنگ سیلون، مشمولہ: زندگی، نقاب، چہرے، ص ۲۶۴

۱۳۔ غلام عباس، کن رس، مشمولہ: زندگی، نقاب، چہرے، ص ۳۶۵۔۳۶۶

۱۴۔ ن۔م۔ راشد، جاڑے کی چاندنی، مشمولہ: غلام عباس: فکر و فن، ص ۳۵